© rasailojaraid.com

مسلمانانِ بنی اسرائیل دہلی سلطنت کے عہد میں

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

قدیم اسلامی عربی لٹریچر میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حجاز کے یہودیوں کے مخالفانہ رویہ کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ لیکن اُن سے جنگوں میں مسلمانوں کی فتح اور اُن سے صُلح کا معاہدہ ہونے کے بعد یہودیوں کو اسلامی مملکت میں مکمل مذہبی اور سماجی آزادی مِل گئی تھی۔ وہ ذِمّی کی حیثیت سے محفوظ ہو گئے تھے۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی دور ہی میں نہیں، ان کے بعد بھی مسلمان مذہبی تنگ نظری اور تعصبات سے آزاد تھے اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ ان کے اندر خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ تھا اور وہ انسانی ہمدردی سے سرشار رہتے تھے۔ چنانچہ اسلامی مملکت میں غیر مسلم لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ مثالی رہا ہے۔ مسلم حکمراں طبقہ بھی سماجی انصاف کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین تفریق نہیں کرتا تھا۔ مثال کے طور پر ذمیّوں یعنی غیر مسلم شہریوں کے ساتھ حکمراں طبقہ کو اچھے سلوک کی تلقین کرتے ہوئے امام ابویوسف اپنی تالیف "کتاب الخراج" میں حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ ایسے ذمیّوں کی جو روزی کمانے سے معذور تھے اُن کی بیت المال سے مدد کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک بوڑھے بھکاری کو کسی کے دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا تو اس کے نزدیک جاکر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: تمہارا مذہب کیا ہے؟ بھکاری نے کہا میں یہودی ہوں۔ عمر فاروقؓ: تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ بھکاری نے جواب دیا: میں بھیک سے جزیہ ادا کرتا ہوں اور اپنی معاش فراہم کرتا ہوں۔ عمر فاروقؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اُسے کچھ اندر سے لاکر دیا۔ پھر بیت المال کے افسر اعلیٰ کو بُلا کر کہا: اس کا اور اس جیسے معذور لوگوں کا خیال رکھو۔ بخدا یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی کھائیں اور بڑھاپے میں اس کو بے سہارا چھوڑ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیں۔ عمر فاروقؓ نے اُس کا اور اس جیسے معذور ذمیوں کا جزیہ معاف کر دیا۔[1]

ایشیا، اور افریقہ کے مختلف ممالک میں اسلام کے فروغ اور وہاں مسلم حکومت قائم ہونے پر مسلمانوں کے ساتھ یہودی تجار بھی آباد ہو گئے۔ ہر ملک میں یہودیوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کیے جو کہ اُن کی بین الاقوامی تجارتی انجمن (diaspora) کا حصہ تھے۔ بحری اور برّی تجارت میں شمولیت اور سُود پر روپیہ دینے کے کاروبار کی وجہ سے اُن کے سرمایہ میں بڑا اضافہ ہوا۔ ابتدائی ہندوستانی فارسی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کے سلسلے میں یہودی تجار سلطنت غزنی، غور کے پہاڑی علاقہ اور خراسان میں کثیر تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ چونکہ وسط ایشیا کے ملکوں کی خوشحالی اور وہاں صنعت و حرفت کی ترقی بیرونی تجارت کے فروغ سے وابستہ تھی لہٰذا حکمراں طبقہ تجار کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرتا تھا۔ خواجہ فریدالدین عطار کے مطابق اُن کے اپنے وطن خراسان میں اتنے یہودی رہتے تھے کہ اُن کے ادا کیے ہوئے جزیہ سے وہاں کا حکمراں اپنے جملہ ذاتی مصارف پورے کر سکتا تھا۔ حکمراں مذہبی تھا اور اس کی نگاہ میں دوسرے ٹیکسوں سے حاصل کیے ہوئے روپیہ کی بہ نسبت جزیہ کا روپیہ شریعت اسلامی کے مطابق پاک اور صاف تھا۔ خواجہ عطّار فرماتے ہیں: "ایک دن ایک دوست نے اُن سے کہا کہ فلاں شخص (یعنی حکمراں) بطریق حلال روزی کماتا ہے یعنی یہودیوں سے جزیہ وصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اُس سے اچھی کمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ شیخ نے فرمایا "میں اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں تنگِ جہاں ہوں اگر سو یہودی بھی مجھ سے جزیہ لیں تو کم ہے۔[2]

---

[1] کتاب الخراج۔ بحوالہ خورشید احمد فارق، جائزے، حصہ اول، دہلی ۱۹۸۱ء ص ۲۷۲۔ کتاب الخراج خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کے عہد میں اس کی رہبری کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کا شمار عربی کی قدیم ترین تصنیفات میں ہوتا ہے۔

[2] عطّار کے اشعار ہیں:

رفیقی گفت با من کان فلانی — حلالی می خورد قوتِ جہانی
کہ جزیہ از جہودان می ستاند — وز آن جا، می خورد بہ زین کہ داند
بدو گفتم کہ من اَن می ندانم — من آن دانم کہ از تنگ جہانم
کہ باید صد جہودِ بس پریشان — کہ تا خواہند از من جزیہ ایشاں =

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجارت کے علاوہ یہودی مختلف علوم، صنعت و حرفت اور فنونِ لطیفہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض اہلِ علم اور ماہرینِ فن مسلم حکمراں اور رؤسا، کے درباروں سے بھی منسلک ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشین بغیر مذہبی تعصب یا تفریق کے اہلِ دانش اور اصحابِ فن کی قدر دانی کرتے تھے۔ اس سے یہودی، عیسائی اور ہندو برابر مستفیض ہوئے۔[1]

سلطنتِ دہلی کی تاریخ وسط ایشیا، کے مذکورہ بالا علاقوں سے منسلک تھی اس لیے غور، غزنی اور خراسان کے مسلمانوں کی طرح معلوم ہوتا ہے یہودی تجار نے بھی ہجرت کر کے دہلی سلطنت کا رخ کیا۔ یہود زمانۂ قدیم سے ایک خاص تہذیب کے علم بردار تھے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلم ثقافت کے ارتقا میں ان کا اہم رول رہا ہوگا۔ منہاج سراج جوزجانی نے اپنی تاریخ "طبقاتِ ناصری" میں یہودیوں کا ذکر "دینِ مہتر موسیٰؑ" کے پیرو کے نام سے کیا ہے۔[2] اکثر مسلم ممالک میں کچھ یہودی اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان بھی ہو جاتے تھے۔ یہ اور ان کے ورثا، عام یہودیوں اور اپنے مابین فرق کرنے کی غرض سے اپنے نام کے بعد بنی اسرائیل یا اسرائیل لگا لیتے تھے۔[3] اس دور کی تاریخ کی کتابوں میں تو یہودیوں کا ذکر بہت

= ملاحظہ کیجیے: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی ج پنجم لاہور ۱۹۷۰ء ص ۴۵۲-۴۵۳۔

[1] فخر مدبر نے ایک عراقی عیسائی طبیب ابو سعید موصلی کا ذکر کیا ہے کہ وہ سلطان بہرام شاہ کے عہد میں غزنی آیا اور جلد ہی اپنی طبی مہارت کی بنا پر مشہور ہو گیا۔ سلطان کے حرم میں ایک ہندوستانی کنیز تھی جو کہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے سلطان کی منظورِ نظر ہو گئی تھی۔ اتفاقاً وہ سخت بیمار ہو گئی، شاہی اطبا، اس کے علاج میں ناکام رہے۔ بالآخر ابو سعید موصلی کو اس کے علاج کے لیے طلب کیا گیا۔ طبیب نے کہا کہ وہ مریض کی نبض جانچنے کے علاوہ اس کے چہرہ کو بھی دیکھنا چاہے گا۔ سلطان نے مجبوراً اجازت دے دی۔ جب طبیب نے کنیز کو دیکھا تو وہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور گھر واپس ہونے پر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ معلوم کرنے پر اس نے سلطان کے مصاحبین سے کہا کہ اگر اس کی شادی کنیز سے کر دی جائے تو وہ مسلمان ہو کر زندہ رہنا چاہے گا۔ جب سلطان کو طبیب کے متعلق معلوم ہوا تو اس کو سخت غصہ آیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے ابو سعید موصلی کی شرط مان لی اور اس کو مسلمان بنا کر اس سے کنیز کی شادی کر دی۔ اس کنیز سے طبیب کے کئی بچے ہوئے۔ جو کہ فخر مدبر کے مطابق بڑے اچھے مسلمان تھے۔ ان کا باپ شاہی اطبا میں اچھا مقام رکھتا تھا۔ محمد بن منصور بن سعید ملقب بمبارک شاہ معروف بفخر مدبر۔ آدابِ الحرب والشجاعۃ، بتصحیح احمد سہیلی خوانساری۔ ایران ۱۳۴۶ھ شمسی، ص ص ۴۲ تا ۴۵۔

[2] طبقاتِ ناصری جلد اول بتصحیح عبدالحی حبیبی، کابل ۱۹۶۳ء ص ۳۲۵۔ [3] تاریخ مدبر ص ۷۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کم پایا جاتا ہے لیکن ہمارے صوفی لٹریچر میں یہودیوں کی اسلامی تصوف سے دلچسپی اور صوفیاء کی طرف ان کے میلان کا کافی تفصیل سے ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ اس تفصیل میں اکثر مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت کے ساتھ ساتھ افسانوی حکایات بھی ہیں تاہم اس میں تاریخی واقعات کی بھی کمی نہیں ہے [۱]

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یورپ کے عیسائی [۲] اور مسلم علماء بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہودی مذہبی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے تصور کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اللہ تعالیٰ کا دشمن اور قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں۔ ابوریحان البیرونی مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا شوق رکھتے تھے جیسا کہ اُن کی شہرہ آفاق تالیف 'کتاب الہند' سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہندو مذہب اور کلچر پر پہلی غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ البیرونی اپنی ایک دوسری تالیف "نہایت الاماکن" جو کہ علم جغرافیہ سے متعلق ہے، میں قدیم جغرافیہ دانوں کو درپیش دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں نسلی اور سماجی تقسیم اور انسانی گروہوں کے درمیان مذہبی تعصبات کی بناپر دشمنی تھی۔ راستے غیر محفوظ تھے موت اور ہلاکت کے خطرے کی وجہ سے لوگ دور دراز کے علاقوں کے سفر سے بچتے تھے لہٰذا معلومات کے ذرائع محدود تھے اور

---

[۱] صوفیاء کرام کے تذکروں سے ان افسانوی حکایات کو الگ کرنا علم وتحقیق کی ایک بڑی خدمت ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ حکایات صوفیاء کرام کی زندگی کا ایک لازمی جزبن گئی ہیں۔ ان کے بغیر ان کا ذکر خیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ بعد کے اصحاب علم ہمارے غیر محتاط تاریخ نگاروں یا حکایات نویسوں کے بیانات کو بغیر کسی نقد وتبصرہ کے نقل کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح ان کی خاموش تصدیق ہوتی رہتی ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ نقد وجرح کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس طرح کے واقعات یا حکایات خود اس مضمون میں موجود ہیں لیکن فاضل مقالہ نگار نے جن کی نظر ہندوستان کی مسلم تاریخ پر بڑی گہری ہے، ان کی صحت وعدم صحت سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

(جلال الدین)

[۲] اس ضمن میں شکسپیر کا ڈرامہ (Merchant of venice) کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شکسپیر کے مطابق یہودی عیسائیوں کی ایذارسانی کے لیے تیار رہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہروں اور ملکوں کے متعلق اُن کی معلومات ناقص ہوتی تھیں۔ اس سلسلے میں البیرونی یہودیوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں کہ یہودیوں کے نزدیک مذہبی ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ غیر یہودیوں کو فریب کے ذریعہ قتل کرنا یا اُن کو ایذا پہنچانا تھا[١] لیکن اس علم کے باوجود سلطنت غزنی اور دوسرے مسلم ممالک میں یہودیوں کے ساتھ عمدہ سلوک ہوتا تھا اور یہودی تجار کی قدر دانی ہوتی تھی جیسا کہ صوفی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے۔

شیخ علی ہجویری کی تالیف "کشف المحجوب" اور سدید الدین محمد عوفی کی معرکۃ الآرا کتاب "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" میں ابوعلی فضیل بن عیاض کے احوال میں آتا ہے کہ وہ ابتدائی زمانہ میں رہزن تھے۔ وہ جس شخص کو لوٹتے تھے اس کا نام اپنی ڈائری میں مع اس کے سامان کے درج کر لیتے تھے۔ جب اُن کو توفیق الٰہی ہوئی تو انھوں نے رہزنی کا پیشہ ترک کر دیا اور صحیح معنوں میں تائب ہو گئے۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے اپنی ڈائری کے مطابق لوگوں سے مل کر اُن کا مال یا اس کی قیمت دینے لگے۔ جب اُن کے پاس مال اور روپیہ ختم ہو گیا تو وہ لوگوں سے ملتے اور معافی کے خواستگار ہوتے۔ لوگ ان کی حالتِ زار اور بدلے ہوئے رویہ سے متاثر ہو کر اُن کو معاف کر دیتے تھے۔ لیکن اُن کے لوٹے ہوئے لوگوں میں ایک یہودی بھی تھا۔ جب وہ یہودی کے پاس گئے اور معافی مانگی تو اُس نے کہا کہ یا تو وہ اس کا مال واپس کریں یا اُس کے عوض میں اُس کی ملازمت کریں۔ مجبوراً فضیل بن عیاض کو اس کی شرط ماننی پڑی۔ یہودی نے اپنے گھر کے سامنے ریت کا ایک ٹیلہ اُن کو دکھایا اور کہا کہ وہ اس کو صاف کر دیں۔ یہ کام ایسا تھا کہ وہ اس کو ایک طویل مدت میں بھی صاف نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم وہ اس کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کئی دن کے بعد ایک شب زبردست ہوا کا طوفان آیا جب صبح ہوئی تو دیکھا گیا کہ ٹیلہ صاف ہو چکا ہے۔ یہودی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ گھر کے اندر واپس گیا اور کمرے میں بستر کے نیچے کچھ رکھ کر باہر آیا اور فضیل بن عیاض کو گھر کے اندر لے جا کر اُن سے کہا کہ فلاں کمرے میں تکیہ کے نیچے

---

[١] ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کی انگریزی تصنیف
Perso-Arabic Sources on the Life and Conditions in the Sultanat of Delhi, New-Delhi 1992, P. XII

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سونے کے سکّے رکھے ہیں وہ اُن کو اٹھا لائیں۔ چونکہ فضیل صدق دل سے تائب ہو گئے تھے اور اُن پر فضل ربی تھا لہٰذا تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی خاک سونے کے سکوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ لہٰذا فضیل ان سکّوں کو اٹھا کر یہودی کے پاس لے آئے۔ یہودی نے سکّے دیکھ کر اُن سے کہا کہ اُس کو اسلام کے سچا دین ہونے میں جو شبہ تھا وہ ختم ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے اپنی مذہبی کتابوں سے اخذ کیا تھا کہ سچے دین کے ماننے والے صالحین کو اللہ یہ صلاحیت عطا فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اُن کے چھونے سے خاک سونے میں بدل جاتی ہے۔ میں نے آزمائش کے لیے تکیہ کے نیچے خاک رکھدی تھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو مصیبت سے نجات دینا چاہتے تھے اور مجھے اسلام قبول کرنے کی سعادت سے سرفراز کرنا تھا لہٰذا خاک سونا بن گئی۔ اب میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کو معاف کرتا ہوں۔[1]

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں اُن کا ایک نومسلم مرید اپنے بھائی کے ساتھ حاضر ہوا اور شیخ سے کہا کہ وہ اُس کا بھائی ہے۔ شیخ نے پوچھا: کیا تمہارا بھائی اسلام کی طرف مائل ہے۔ نومسلم: اس کو اسی مقصد سے لایا ہوں کہ حضرت کی نظر کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے۔ شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے فرمایا کہ ایسے لوگوں سے کتنا ہی کہا جائے اُن پر اثر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ہاں اگر وہ کسی صالح آدمی کی صحبت میں آئیں تو اس کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ پھر مزید وضاحت کے لیے آپ نے شیخ ابو یزید بسطامیؒ (م ۸۷۴ء) اور ان کے ایک یہودی عقیدت مند کا واقعہ بیان فرمایا کہ شیخ کی روحانی عظمت سے متاثر ہو کر ایک یہودی اُن کے پاس آتا تھا۔ جب شیخ نے انتقال کیا تو وہ یہودی اُن کے مزار کی زیارت کے لیے آنے لگا۔ ایک دن کچھ مسلمانوں نے یہودی سے کہا کہ آپ شیخ کی زندگی میں اُن سے عقیدت رکھتے تھے اور اب اُن کی موت کے بعد بھی اُس عقیدت میں کمی

---

[1] جوامع الحکایات ولوامع الروایات۔ اقتباس کے انگریزی ترجمہ کے لیے دیکھئے:

Perso-Arabic Sources on the Life and Condition in the Sultanat of Delhi, op. cit, PP. 13-14

حضرت فضیل بن عیاض کا شمار دور اول کے اکابر صوفیاء میں ہوتا ہے۔ ان کی عظمت اور بزرگی اس طرح کے واقعات کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی طرف انھیں منسوب کرنے سے پہلے مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے (جلال الدین)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقع نہیں ہوئی لہٰذا اُن کی قبر کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اگر آپ کو شیخ پر ایمان تھا تو ان کی پیروی میں آپ اسلام قبول کیوں نہیں کرتے؟ اس بات کو سُن کر یہودی نے جواب دیا:

"کیا مسلمان بنوں؟ اگر اسلام وہ ہے کہ جس پر بایزید عمل پیرا تھے تو میں اس کا اہل نہیں ہوں یعنی میری طاقت سے باہر ہے اور اگر اسلام یہ ہے کہ جس کی تم لوگ پیروی کرتے ہو تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے"۔[۱]

ایک اور یہودی جو کہ اسلام قبول کرنے کے بعد پیر طریقت کی حیثیت سے اُبھرے شیخ ابوالبرکات متوفی ۱۱۶۵ء ہیں۔ یہ زندگی کے آخری زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ لیکن شوق و ذوق کی بنا پر فلسفہ تصوّف پر بہت جلدی دسترس حاصل کر لی تھی۔ ان کا بھی اسلامی تصوف کی تاریخ میں ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے نام آتا ہے۔[۲]

گیارہویں صدی عیسوی کے عظیم صوفی بزرگ شیخ ابو سعید ابوالخیر (۱۰۴۹ء) کے احوال میں سدید الدین محمد عوفی نے لکھا ہے کہ نیشاپور کے ایک امیر شیخ ابو محمد جوینی جو کہ شیخ کے معتقد نہیں تھے اور اُن کے طور طریقوں پر معترض رہتے تھے اُن کی ملازمت میں ایک یہودی تھا جو کہ اُن کی املاک کا انتظام کرتا تھا۔ اس کی راست بازی سے ابو محمد جوینی متاثر ہو کر اس کا لحاظ کرتے تھے اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ یہودی اسلام قبول کر کے ان کا ہم مذہب بن جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہودی کی ترغیب کے لیے اس کو پیش کش کی کہ وہ اس کو اپنی جائداد کا ایک تہائی حصہ دے دیں گے اگر وہ اسلام قبول کر لے۔ لیکن دنیاوی منفعت کی خاطر یہودی اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ ایک دن وہی یہودی شیخ کی خانقاہ کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس وقت شیخ اپنا وعظ شروع کرنے والے تھے۔ یہودی کے دل میں شیخ کا وعظ سننے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک [illegible] ہی ہے اور اگر خانقاہ میں داخل ہو کر وعظ سنے گا تو کوئی اس کو شناخت نہیں کر پائے گا۔ وہ اندر جا کر ایک ستون کے پیچھے بیٹھ گیا۔ شیخ ابو سعید

۱۔ میر حسن سجزی۔ فوائد الفواد۔ (نول کشور پریس) ص ۱۸۴

۲۔ ملاحظہ کیجیے ہنری کوبان A vicena and the visionary Recital Eng. tr. W.R. Trask, New-yark, 1960, PP-89-90.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابوالخیر نے اس کو آواز دی اور کہا کہ وہ سامنے آجائے۔ یہودی پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور وہ سامنے آگیا[۱]۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اُس نے شیخ کے دست مبارک پر اسلام قبول کرلیا۔ شیخ نے اس سے کہا کہ وہ اپنے آقا ابو محمد جوینی کے پاس جاکر اُس سے شعائرِ اسلام سیکھ لے اور یہ بھی بتا دے کہ ہر بات کے لیے ایک وقت متعین ہے۔ وقت آنے پر میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اب ضرورت نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنی جائداد کا تہائی حصّہ دیں۔ یہ واقعہ سُن کر ابو محمد جوینی شیخ کا قائل ہوگیا[۲]۔

شیخ محمد حسین گیسو دراز کی ملفوظات جوامع الکلم میں ایک یہودی کا تذکرہ خواجہ سالاری کے حوالہ سے اس طرح آتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے جماعت خانہ میں ایک مسافر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے پاس خواجہ اقبال آئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ اس نے شیخ سے کیا کہا تھا کہ وہ برابر رو رہے ہیں۔ ان کے آنسو رکتے ہی نہیں اور حالت غیر معمولی ہے۔ مسافر نے بتایا کہ جب اُن کی شیخ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اُن سے سفر کے واقعات پوچھے۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا انھوں نے خواجہ محمد بکا کو بھی دیکھا تھا۔ اس پر مسافر نے شیخ کو بتایا تھا وہ ایک نومسلم یہودی صوفی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ یہ یہودی اور اس کی ہمشیرہ مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ یہودی زہد اور تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگا اور پیرِ طریقت کی حیثیت سے مشہور ہوگیا۔ شہر کے لوگوں نے اس سے متاثر ہوکر اس کے لیے ایک خانقاہ بنوا دی۔ خواجہ محمد بکا ایک امیر سوداگر کے بیٹے تھے لیکن اُن کو مذہب سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ وہ مال و دولت سے متنفر ہوگئے۔ وہ سب ترک کرکے نومسلم یہودی شیخ سے وابستہ ہوگئے اور اس کی خانقاہ کے ایک حُجرے میں رہنے لگے۔ جب یہودی بیمار ہوا تو وہ اور اس کی ہمشیرہ تیمار داری کرنے لگے۔ ایک دن جب وہ اپنے پیر کے حجرے کے نزدیک

---

[۱] یعنی حضرت ابوسعید نے اس اجنبی یہودی کو پہچان لیا۔ ممکن ہے اس کے نام سے اسے آواز دی ہو اور اس کے سلسلہ میں ابو محمد جوینی کی کوششیں بھی ان پر از خود منکشف ہوگئی ہوں۔ اس طرح کے خارقِ عادت واقعات کے بغیر صوفیائے کرام کے تذکرے مکمل نہیں ہوتے۔ (جلال الدین)

[۲] سدید الدین محمد عوفی جوامع الحکایات ولوامع الروایات کا انگریزی ترجمہ کیلئے دیکھئے۔
Perso-Arabic Sources on the Life and Conditions in the Sultanat of Delhi P.21.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچے تو انھوں نے پیر کو اپنی ہمشیرہ سے کہتے ہوئے سنا کہ اس کا آخری وقت آپہنچا ہے اور وہ گواہی دے گی کہ وہ اپنے آبائی دین پر ختم ہو رہا ہے۔ یہ سن کر خواجہ محمد یکا زیادہ متوجہ ہو کر اُن کی گفتگو سننے لگے۔ انھوں نے یہودی کی بہن کو کہتے ہوئے سُنا "بھائی ایسا مت کہو۔ یہودی نے پھر کہا کہ وہ اپنے آبائی دین پر ختم ہو رہا ہے۔ پھر بہن نے کہا" ای بدبخت ایسا مت کہہ" لیکن یہودی نے قرآن، پیغمبر اسلام اور شعائر اسلام سے انکار کرتے ہوئے انتقال کیا۔ شیخ آخرت کے ڈر سے رونے لگے کہ آدمی کا زندگی بھر کا زہد و تقویٰ بیکار ہو جاتا ہے اگر اس کا صحیح ایمان پر خاتمہ نہ ہو۔[۱]

منہاج سراج جوزجانی اور سولہویں صدی کے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ خراسان، غور اور غزنی کے علاقوں میں یہودی تجار خاصی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ غوری سلاطین کے پایۂ تخت فیروزکوہ اور غور کے علاقہ میں یہودی تجار کی آبادی گیارہویں صدی عیسوی سے معلوم ہوتی ہے حالانکہ منہاج سراج جوزجانی مقبول عام روایت کی بنا پر غوری سلاطین اور یہودی تجار کے دوستانہ تعلقات اُن کے جدامجد امیر بنجی شنبانی کے عہد سے بتلاتا ہے[۲] تیرہویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آغاز پر جب چنگیز خاں اور منگولوں کا تسلط وسط ایشیا، قلمرو غزنی اور خراسان (موجودہ افغانستان) پر ہو گیا۔ فیروزکوہ اور دوسرے شہر نیست و نابود ہو گئے تو مسلم خواص کی طرح یہودی تجار بھی مہاجر کی حیثیت سے ہندوستان آ گئے ہوں گے کیونکہ تیرہویں صدی عیسوی کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلمانوں میں ایک علیٰحدہ برادری بنی اسرائیلان موجود تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک عرب نومسلم یہودی صوفی شیخ بدیع الدین ملقب بشاہ مدار ہندوستان تشریف لائے۔ یہ بڑے عالم تھے۔ یہودی، عیسائی اور اسلامی مذہبی روایات سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ اسلامی تصوّف کے مختلف مکاتب فکر کا بھی علم رکھتے تھے۔ جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوی میں اس قدر صلاحیت پیدا کر لی کہ اس میں وعظ کرنے لگے۔ وہ اپنے روحانی کمال کی بنا پر

---

[۱] جوامع الکلم۔ ص ص ۲۲۴ تا ۲۲۵۔

[۲] طبقات ناصری۔ جلد اول۔ ص ص ۳۲۵ تا ۳۲۶۔ ۴۲۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صفِ اول کے درویش تصور کیے جانے لگے۔ وہ جس شہر سے گذرتے وہاں مریدوں کی ایک کثیر تعداد چھوڑ جاتے تھے۔ لہٰذا مختصر سی مدت میں سلسلہ مداریہ کی ہندوستان میں داغ بیل پڑ گئی تھی۔ معتبر تاریخی ماخذ سے آپ کے بارے میں جو مختصر تفصیل ملتی ہے اُس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک روحانی پیشوا کے انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے اُن کے سوانح نگار شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے اُن کے احوال میں مقبول عام افسانوی قصّوں اور تاریخی واقعات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ لہٰذا افسانوی روایات سے تاریخی واقعات کو علیحدہ کرنا کافی دقت طلب کام ہوگیا ہے۔ معاصر ماخذ اور سولہویں صدی عیسوی کی معیاری کتابوں میں شاہ مدار کا ذکر اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے باوجود ان کی روحانی عظمت اور مذہبی رواداری پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ذکر اُن کے صحیح خد و خال کو سمجھنے میں بھی معاون ہوگا۔ ذیل کی سطور میں اس کا اختصار کے ساتھ تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ مدار کے خلیفہ قاضی محمود کنتوری کی تالیف "رسالہ ایمان محمودی" (مفقود) کے مطابق[1] شاہ مدار کے والد ابو اسحاق یہودی تھے اور اپنے مذہب کے پابند تھے۔ وہ شام کے باشندے تھے۔ اُن کا شجرہ نسب حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ سے ملتا تھا۔ شاہ مدار ان کی تنہا اولاد تھے۔ والد نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ وہ توراۃ اور یہودی شریعت سے جلد ہی روشناس ہوگئے۔ والدین کے انتقال کے بعد شاہ مدار کو دوسرے مذاہب کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ خاص طور پر وہ اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہوگئے۔ ہشام کے پیر طریقت شیخ طیفور شامی کے حلقۂ مریدین میں داخل ہو کر اُن سے سلوک کی تعلیم حاصل کی۔[2] شام سے ہجرت کر کے مکہ اور مدینہ کی زیارت کی۔ اس کے بعد عراق آئے بغداد، نجف اور دوسرے مقامات پر بزرگانِ دین کی قبور کی زیارت کی اور پھر دوسرے ممالک کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

حجاز کے زمانہ قیام میں شاہ مدار کی ملاقات شیخ اشرف جہانگیر سمنانی سے ہوئی۔ آخرالذکر اُن کی روحانی عظمت سے متاثر ہوئے۔ لطائف اشرفی (ملفوظات) کے لطیفہ ۱۴ (چودہ) میں شیخ اشرف جہانگیر سمنانی شاہ مدار کے بارے میں فرماتے ہیں "حضرت شیخ بدیع الدین الملقب

---

[1] عبدالرحمٰن چشتی۔ مراۃ مداریہ۔ مخطوطہ خدا بخش لائبریری۔ اوراق ۳۰ب تا ۷ الف۔

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الاخیار۔ احمد پریس دہلی۔ ص ۱۶۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشاہ مدار اویسی (درویش) تھے۔ عالی مشرب کے حامل تھے اور بہت سے نادر علوم جیسے ہیمیا، سیمیا، اور ریمیا، پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے سفر میں ہم ساتھ تھے۔ لہٰذا ایک دوسرے سے مستفیض ہوئے تھے۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مطابق وہ بحری راستہ سے گجرات آئے جہاں پر مختصر قیام کے بعد اجمیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ اجمیر میں بھی اُن کا قیام مختصر رہا۔ وہاں سے شہر محمد آباد عرف کالپی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملہ سے دہلی کی تباہی کے بعد شمالی ہندوستان میں جو علمی اور ثقافتی مراکز اُبھرے ان میں جونپور، شادی آباد عرف مانڈو اور احمد آباد کے علاوہ شہر کالپی بھی تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر کالپی کو ملک زادہ محمود ترک نے اپنی چھوٹی سی خود مختار سلطنت کا پایہ تخت بنایا اس میں قلعہ، حصار، محلات اور جامع مسجد کی تعمیر کر کے ایک حسین شہر کی شکل دے دی تھی۔ علاوہ ازیں دہلی سے ہجرت کرنے والے علماء، فضلا، مشائخ اور اہل حرفت کی اعانت کر کے اُن کی بڑی تعداد کو کالپی میں سکونت اختیار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی موجودگی نے کالپی کو علم و ثقافت کا مرکز بنا دیا تھا۔

شاہ مدار کالپی میں سلطان محمود ترک کے بیٹے قادر شاہ کے ۱۴۱۲ء میں تخت نشین ہونے کے بعد وہاں پہنچے۔ اُن کے مریدوں نے اُن کے قیام کے لیے وہاں خانقاہ تعمیر کر دی۔ جلد ہی اُن کی شہرت شہر اور شہر کے باہر پھیل گئی۔ ہندو مسلمان اُن سے فیض یاب ہونے کے لیے اُن کی خانقاہ میں آنے لگے۔ شاہ مدار کی مقبولیت اور شہرت سے متاثر ہو کر سلطان قادر شاہ بھی اُن سے ملاقات کا خواہش مند ہوا لیکن جب وہ شاہ مدار کی خانقاہ پر پہنچا تو شاہ مدار کے مریدوں نے سلطان سے کہا یہ وقت ان کی ملاقات کا نہیں ہے۔ سلطان وہاں سے مایوس لوٹا۔ بعد میں کسی نے سلطان کو بتایا کہ جب وہ خانقاہ پر پہنچا تھا تو اس وقت شاہ مدار ہندو جوگیوں سے محوِ گفتگو تھے۔ سلطان نے ناراض ہو کر شاہ مدار کو کالپی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ لہٰذا شاہ مدار کالپی سے روانہ ہو کر سلطنت شرقی کے پایہ تخت جونپور پہنچ گئے۔[2]

---

[1] لطائف اشرفیہ۔ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ لطیفہ ۱۴۔

[2] اخبار الاخیار۔ ص ص ۱۶۶ تا ۱۶۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس عہد کا ایک معاصر کتبہ چندیری کی ایک باولی میں ملا ہے۔ اس میں کندہ عبارت ہے کہ باولی کی تعمیر رفاہ عام کے لیے سلطنت مالوہ کے وزیر طفی نے اپنے روپیہ سے ۱۴۳۲ء میں کرائی تھی اور طفی شاہ مدار کے مرید تھے۔ شاہ مدار کے بارے میں متقی اور پرہیزگار درویش کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں[۱] اسی طرح ضلع پٹنہ کے قصبہ ہلسہ میں شاہ مدار کے خلیفہ میران سید جمن مداری کے مقبرہ کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ مدار کے مریدین میں عوام اور خواص دونوں شامل تھے اور حکمراں طبقہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں شاہ مدار اور اُن کے خلفاء سے عقیدت رکھتا تھا[۲] علاوہ ازیں لکھنؤ کے شاہ مینا جو کہ شاہ مدار کے زمانہ میں بچے تھے۔ وہ شاہ مدار کا تذکرہ سلطان المشائخ کے لقب سے کیا کرتے تھے[۳] ملا عبدالقادر بدایونی "نجات الرشید" میں شاہ مدار کا تذکرہ اسلام کے اہم ترین صالحین میں کرتے ہیں۔ اگرچہ شاہ مدار سے متعلق بدایونی کی شامل کردہ روایات میں بھی خوارق العادات اور ناقابل یقین عناصر شامل ہیں لیکن بہر حال ان روایات سے شاہ مدار کی روحانی عظمت اور صلاحیتوں پر ایک گونہ روشنی پڑتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مُلا عبدالقادر بدایونی بڑے محتاط عالم دین اور تاریخ داں تھے۔ وہ مورخ کے فرائض اور ذمہ داریوں سے واقف تھے۔ انھوں نے اپنی تالیفات منتخب التواریخ کی تین جلدوں اور نجات الرشید میں بڑی چھان بین کرکے تاریخی واقعات اور روایات کو شامل کرکے معیاری علمی تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یقیناً شاہ مدار کے متعلق بھی اُن کے مآخذ قدیم اور معتبر رہے ہوں گے۔ بدایونی کے مطابق شاہ مدار دل نشیں خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ ایک فصیح البیان مقرر تھے اور اُن کا چہرہ نور سے اس قدر منوّر رہتا تھا کہ دیکھنے والوں کی اس پر نظر جم نہیں سکتی۔ بدایونی نے شاہ مدار اور جونپور کے

---

[۱] ملاحظہ کیجئے: Epigraphia Indica: Arabic and Persian Supplement, ed. Z.U.A. Desai, 1964, P. 64

[۲] ملاحظہ کیجئے قیام الدین احمد Corpus of Arabic and Persian Inscriptions of Bihar Patna, 1973, P. 132

[۳] ملفوظات شاہ مینا، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری۔ ورق ۶۴ الف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے درمیان خط و کتابت کا بھی ذکر کیا ہے جو قابلِ نقل ہے۔ بدایونی لکھتے ہیں: "ایک مرتبہ ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی نے اس خطہ کے سلطانِ درویشاں بدیع الحق والملتہ والدین شاہ مدار قدس اللہ سرہ العزیز کو خط لکھا اور پوچھا کہ حدیث (نبوی) کے مطابق علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں لہٰذا ایسا ہی تصور کرنا چاہیے۔ شاہ مدار نے جواب میں لکھا: ایسا نہیں ہے کیونکہ میراث ہر وارث کو خود بخود بغیر کسی کاوش کے ملتی ہے۔ آپ لوگ یعنی علماء تحصیل علم کے لیے بڑی جد وجہد کرتے ہیں۔ تب اس کے نتیجہ میں علم کا کچھ حصہ نصیب ہوتا ہے۔ دراصل رسول اللہ کے وارث اہلِ فقر ہیں جن کو بغیر کوشش کے علمِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔[1]"

کچھ عرصہ بعد ملک العلماء شہاب الدین اور شاہ مدار میں شرعی امور کے سلسلے میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اول الذکر کے ایما پر جونپور کے سلطان ابراہیم شرقی نے شاہ مدار سے تعرض کیا لہٰذا وہ جونپور سے ہجرت کر کے مکن پور آ کر سکونت گزیں ہو گئے۔ اس زمانہ میں مکن پور خطۂ قنوج میں داخل تھا۔ اُن کے مریدوں نے اُن کے لیے آبادی سے علیحدہ خانقاہ تعمیر کر دی تھی۔ اگرچہ مکن پور ایک غیر معروف اور غیر اہم گاؤں تھا لیکن شاہِ مدار کے آنے سے وہ ایک مشہور مقام بن گیا۔ وہاں بھی مختلف مقامات سے لوگ شاہ مدار سے فیض یاب ہونے کے لیے کثیر تعداد میں آنے لگے۔ اُن کے دیدار اور ملاقات کے لیے ہفتہ میں صرف ایک

---

[1] مُلّا عبدالقادر بدایونی، نجات الرشید، بتصحیح سید معین الحق، لاہور ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۷۳۔

حدیث کا یہ مفہوم عجیب سا ہے۔ اس میں تو کہا یہ گیا ہے کہ انبیاءؑ درہم و دینار چھوڑ کر نہیں جاتے بلکہ علم چھوڑ کر جاتے ہیں۔ جو یہ علم حاصل کرے وہی ان کا وارث ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انبیاءؑ کی وراثت بغیر جد وجہد کے مل جاتی ہے۔ مال و جائداد کا تو آدمی بغیر کسب کے وارث ہوتا ہے لیکن علم و فضل کا وارث سعی و جہد سے ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص علم و فضل میں اپنے باپ کا وارث ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ چیز اسے خود بخود مل گئی ہے اور اس کے لیے اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ حدیث میں اسی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انبیاءؑ کی وراثت محنت اور جد وجہد سے حاصل ہو گی بغیر محنت کے اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔ حدیث میں علم کی راہ میں جد وجہد کی ترغیب ہے اور یہاں اس کی نفی کی جا رہی ہے۔ (جلال الدین)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دن معین تھا۔ اُس دن لوگوں کا اس قدر ازدحام رہتا تھا کہ ایک میلہ لگ جاتا تھا۔ خانقاہ کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس میں شاہ مدار کو دیکھنے کے لیے لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ جب شاہ مدار، ہجوم کے سامنے آتے تھے تو ان کے چہرے پر نقاب پڑا ہوتا تھا۔ جیسے ہی وہ نقاب ہٹاتے تھے اور لوگوں کی نظریں اُن کے چہرہ تابناک پر پڑتی تھیں تو وہ فوراً سربسجود ہو جاتے تھے۔ اُن کی تقریر میں ہر حاجت مند کو وہ سب مل جاتا تھا جس سے اس کی پوری تسلی ہو جاتی تھی۔ کسی کو شاہ مدار کو اپنی حاجت بتانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ علاوہ ازیں اُن کی تقریر مربوط اور وضاحت سے بھرپور ہوتی تھی۔ تقریر کے اختتام پر اپنے حجرے میں واپس چلے جاتے تھے۔ یہ بھی ملتا ہے کہ کبھی شخص نے نہ تو ان کے لیے کھانا پکتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی کسی نے اُن کے لباس کو دھوتے ہوئے دیکھا۔ کہتے ہیں کہ قنوج کے قاضی کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ اُن کے پاس احتساب کے لیے آیا۔ جب وہ مکن پور پہنچا تو دربار عام کا وقت تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا جب شاہ مدار نے اپنا نقاب چہرے سے ہٹایا تو سب لوگوں کی طرح قاضی بھی سجدے میں گر گیا۔ مجلس کے ختم ہونے پر، شاہ مدار سے ملا اور کہا کہ اسے بعض مسائل پر گفتگو کرنی ہے اور وہ اُن سے ان کا جواب چاہتا ہے۔ ایک مسئلہ سجدہ سے متعلق ہے کہ وہ اس کو کیسے روا رکھتے ہیں، شاہ مدار نے جواب دیا کہ وہ کسی سے نہیں کہتے (سجدہ کرنے کے لیے) جیسے کہ آپ نے بغیر میرے کہے ہوئے سجدہ کیا۔ قاضی محمود کو بڑا تعجب ہوا اور اُس نے اپنے مصاحبوں سے دریافت کیا کہ واقعی اس نے بھی سجدہ کیا تھا؟ مصاحبوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ پوچھا: کہ نماز جمعہ شعار اسلام ہے آپ شرکت کے لیے کیوں نہیں جاتے؟ شاہ مدار: میں نے اس علاقہ میں مستقل قیام کی نیت نہیں کی ہے۔" قاضی نے کہا: کئی سال سے آپ اس علاقہ میں ہیں۔ آپ مسافر کے زمرہ میں کس طرح آسکتے ہیں۔ شاہ: اگر آدمی کی کسی جگہ مستقل قیام کی نیت نہ ہو تو وہ اُس جگہ مقیم تصور نہیں کیا جاسکتا اور نیت کا معاملہ دل سے ہے۔ تیسرا سوال تھا: پیغمبروں نے کھانا کھایا ہے آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ شاہ مدار:"آپ کو کس طرح علم ہوا کہ میں کھانا نہیں کھاتا۔" قاضی نے کہا کہ بغیر غذا کے حیات ممکن نہیں ہے۔" پھر انھوں نے وہ کھانا شاہ کے سامنے رکھا جو کہ وہ بازار سے خرید کر لائے تھے اور کہا تھا چند لقمہ کھا لیجیے تاکہ تصدیق ہو جائے۔ شاہ مدار:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ لازم نہیں ہے کہ آپ جو بازار سے کھانا لائے ہیں اس کو کھاؤں کیونکہ ہمارا بھی بازار ہے اور وہاں کی غذا سے ہمارے یہاں قوت آتی ہے[1]۔

۱۴۳۶ء میں شاہ مدار کے انتقال کے بعد اُن کی درگاہ مکن پور میں خاص و عام کے لیے زیارت گاہ ہوگئی۔ دستور زمانہ کے مطابق دوسرے بڑے صوفیا کی درگاہوں کی طرح فرماں روایانِ وقت اس درگاہ پر بھی اگر اُن کو اس سمت سے گذرنا پڑتا تھا تو حاضری دینا ضروری سمجھتے تھے۔ سب سے پہلا بادشاہ جس نے درگاہ کے مصارف پورے کرنے کے لیے کئی گاؤں وقف کیے شیر شاہ کا بیٹا اور جانشین اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء تا ۱۵۵۳ء) تھا[2]۔ اورنگ زیب ۱۶۵۸ء میں شاہ شجاع سے جنگ کرنے کے لیے کھجوا کی طرف جارہے تھے تو اُنھوں نے بھی راستہ میں حسب دستور شاہ مدار کی درگاہ پر حاضری دی۔ خوافی خاں کے الفاظ میں "شہنشاہ نے خواص میں منتخب حضرت سید بدیع الدین الملقب بشاہ مدار کے روضہ کی زیارت کی اور دس ہزار روپیہ درگاہ سے متعلق لوگوں کی اعانت کے لیے دیئے[3]"۔

شاہ مدار کے سوانح نگار کے مطابق سترہویں صدی عیسوی میں مسلم خواص میں شاہ مدار کی شخصیت متنازعہ فیہ ہوگئی تھی بعض علما اُن پر زندیق اور ملحد ہونے کا شک کرتے تھے اُن کو شیعہ سمجھتے تھے[4] لیکن سوانح نگاران الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی کے مآخذ کے مطابق اُن کے عظیم درویش بزرگ ہونے میں لوگوں کو شک نہیں تھا۔

شاہ مدار کے اولین اور محبوب خلفا میں قاضی شہاب قدوائی کے احوال سے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک یہودی کثیر تعداد میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے تھے اور وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح

۱۔ نجات الرشید، ص ۱۷۷۔ اس طرح کے واقعات کی مزید تحقیق ہونی چاہیے تحقیق کے بعد بھی صحیح ثابت ہوں تو جو باتیں خلافِ شرع ہیں ان کو رد کردینا چاہیے۔ (جلال الدین)

۲۔ تذکرۃ المتقین، مرتبہ سید محمد امیر حسن، کانپور ۱۳۲۲ھ ص ۱۷۲۔

۳۔ خوافی خاں، ہسٹری آف اورنگ زیب۔ انگریزی ترجمہ معین الحق، کراچی ۱۹۷۵ء ص ۵۲

۴۔ عبدالرحمٰن چشتی، مراۃ مداریہ، ورق ۱۲۵ الف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی علٰحدہ برادری رکھتے تھے۔ اس برادری کے افراد اسلامی اور غیر اسلامی علوم پر دستگاہ رکھتے تھے اور شائستگی اور تہذیب کے لیے مشہور تھے۔ عبدالرحمٰن چشتی قاضی شہاب قدوائی کو بنی اسرائیل قوم کا فرد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ صاحب علم وفضل ہونے کے علاوہ خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھے۔ عین جوانی میں اسلام سے بے پناہ دلچسپی اور دینی جذبہ کی بنا پر دنیاوی عیش وعشرت سے متنفر ہوکر روحانی کمال کے حصول کے لیے گھر سے رخصت ہوکر پیر کامل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ جب لکھنؤ میں اُن کی ملاقات شاہ مدار سے ہوئی تو ان کے گرویدہ ہوکر ان کے حلقہ مریدین میں شامل ہو گئے۔ پیر کی صحبت میں رہ کر کمالات صوری ومعنوی کے حصول میں لگ گئے۔ شاہ مدار کے جونپور کے زمانۂ قیام میں بھی وہ اپنے پیر کی نگرانی میں عبادت اور ریاضت میں مشغول رہے۔ اُن کا شمار شاہ مدار کے عظیم خلفاء میں ہوتا تھا۔[۱]

اس ضمن میں پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی کے دو مزید دانشوروں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ خواجہ اویس گوالیاری اور مُلّا طرزی (شاعر) تھے۔ اِن کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں اُن سے بھی بنی اسرائیلی مسلمانوں کی برادری اور اُن کے مہذب ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ یہ دونوں بنی اسرائیلان سے متعلق تھے اور فرماں روانِ وقت کے ندیم اور درباری تھے۔ خواجہ اویس گوالیاری کو علوم عربیہ پر دسترس کے علاوہ علمِ نجوم، علم ہیئت، رمل اور صنعت اصطرلاب کی صنعت میں کمال حاصل تھا۔ وہ لودی سلاطین کے عہد سے مغلوں کے ابتدائی عہد تک ایک سائنس داں کی حیثیت سے مقبول تھے کیونکہ ہمایوں بادشاہ علمِ نجوم اور علم ہیئت میں دلچسپی رکھتا تھا اس لیے اس نے خواجہ اویس گوالیری کی بڑی قدردانی کی۔

اکبر بادشاہ کے عہد میں بھی وہ مغل دربار سے وابستہ رہے۔ مُلّا قطعی ہروی نے اُن سے متعلق اکبر کے عہد کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے جس سے اُن کی علم نجوم اور رمل میں مہارت پر روشنی پڑتی ہے۔ مُلّا قطعی لکھتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں ولایت (یعنی خراسان) سے ایک نجومی ہندوستان آنے اور اکبر کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ ایک دن دربار میں

---

[۱] مرآۃ مداریہ، ورق ۲۴۴ ب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بادشاہ کے حضور میں کسی شخص نے ایک خوبصورت گائے نذر کے طور پر پیش کی۔ بادشاہ نے نووارد نجومی سے کہا کہ وہ بتائیں کہ "گائے کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ نر ہے یا مادہ اور اس کا رنگ کیا ہے ؟" نجومی: "بچہ نر ہے اور اُس کا جسم سُرخ لیکن صرف اس کی پیشانی پر سفید نشانی ہے۔" اکبر نے خواجہ اویس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ ان کا کیا خیال ہے ؟ خواجہ اویس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا : جو کچھ بتایا گیا ہے قریباً صحیح ہے۔ لیکن بچہ کی دُم سفید ہے اور وہ اس کی پیشانی پر لپٹی ہوئی ہے ورنہ پیشانی بھی سرخ ہی ہے۔" موجود درباریوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ حقیقت جاننے کے لیے گائے کو ذبح کرایا جائے اور دیکھا جائے کہ کون صحیح ہے۔ جب گائے کو ذبح کر کے اس کا بچہ پیٹ سے باہر لایا گیا تھا تو خواجہ اویس کا بتایا ہوا صحیح پایا گیا۔ اس واقعہ کے بعد اکبر بادشاہ خواجہ کے کمالات کا پہلے سے زیادہ معترف ہو گیا اور اُن کی عزت اور قدردانی میں مزید اضافہ ہوا۔[1]

خواجہ اویس کے نواسے مُلّا طرزی کا تعلق بھی بنی اسرائیل کی نسل سے تھا وہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ اُن کے جدِ امجد مُلّا علی احمد اپنی علمی فضیلت اور نیکی اور تقویٰ کی بنا پر بڑے محترم بزرگ تھے۔ مُلّا قطعی ان کے احوال میں بنی اسرائیل کے مسلمانوں کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ اس جماعت کے لوگ درویش نہاد، اولیاء صفت اور خوش طبع ہوتے ہیں۔" مُلّا طرزی ایک خوش گو شاعر تھے اور اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ اُن کا دیوان ان کے زمانہ میں مقبول تھا کیونکہ اُن کے کلام میں جدّت طرازی اور ندرتِ فکر تھی۔ مُلّا طرزی کا ایک لمبا قصیدہ اور چند غزلیں تذکرہ مجموعہ شعرائے جہانگیر شاہی میں شامل ہیں۔[2]

---

[1] مُلّا قطعیؔ ہروی، تذکرہ مجموعہ شعرائے جہانگیر شاہی، مرتبہ محمد سلیم اختر کراچی ۱۹۷۹ء ص ۶۴۔
گائے کے پیٹ میں جو بچہ تھا اس کے بارے میں اتنی باریک تفصیلات سے ایک نجومی اور خواجہ اویس واقف ہوگئے جب کہ قرآن مجید میں ہے کہ "یعلم مافی الارحام" اللہ جانتا ہے کہ رحم میں کیا ہے ؟ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ ہے اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہے ؛ یہاں اس کی تشریح مقصود نہیں ہے ؛ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے مورخین نے کیسی عجیب و غریب حکایات بغیر تحقیق کے قلم بند کر دی ہیں اور عقائد پر اس کے کتنے خراب اثرات پڑتے ہیں۔ (جلال الدین)

[2] ایضاً ص ص ۶۳۔۶۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہمارے عہدِ سلاطین دہلی سے متعلق ماخذوں میں خواجہ محمد یکا کے یہودی نژاد بیر کے علاوہ کسی دوسرے یہودی کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے منحرف یا مرتد ہونے کا ذکر نہیں ملتا اس کے برعکس اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اسلامی شریعت کی پابندی کے شوق و ذوق سے سرشار ہوتے تھے ہمارے ماخذ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنا قدیم آبائی پیشہ یعنی تجارت چھوڑ دیتے تھے۔ جو کچھ بھی مواد ہے اس کی بنا پر یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے یا پھر حکومت کی ملازمت میں آجاتے تھے۔ اُن کی اولاد علم وفضل کی بنا پر حکومت کی طرف سے مِلک یعنی وجہ معاش کے طور پر گاؤں یا زمین حاصل کرتی تھی اور مسلم خواص (elite) کے دوسرے مستحق افراد کی طرح وہ بھی حکومت کی سرپرستی کے مستحق ہوجاتے۔ مختلف علوم کو زندہ رکھنے اور ان کو مزید فروغ دینے میں مسلم نبی اسرائیلان کا رول بھی خاصا اہم رہا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارے ماخذ ہماری مدد نہیں کرتے۔

اعلان

تحقیقاتِ اسلامی کو مسلسل ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں نمونے کا پرچہ طلب کیا جاتا ہے۔ ایسے تمام احباب سے جو واقعی رسالہ کو خریدنے کی غرض سے دیکھنا چاہتے ہوں۔ درخواست ہے کہ وہ دو روپے کے ٹکٹ روانہ فرمائیں۔ ان کی خدمت میں ۹۲ء کا پہلا شمارہ سادہ ڈاک سے بھیج دیا جائے گا جس کی قیمت ۱۲ روپے ہے۔

۱۹۹۵ء کے پہلے شمارہ سے تحقیقاتِ اسلامی کی شرح خریداری حسب ذیل ہوگی۔

اندرونِ ملک	قیمت فی شمارہ	۱۶ روپے
	سالانہ	۶۰ روپے
	لائبریری و ادارے	۸۰ روپے سالانہ
بیرونِ ملک	انفرادی خریدار	۱۰ ڈالر/ ۳۰۰ روپے
	لائبریری و ادارے	۱۵ ڈالر/ ۴۵۰ روپے
پاکستان	انفرادی	۱۲۰ روپے
"	ادارے	۱۵۰ روپے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہند اسلامی تہذیب اور تصوّف

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی ترویج جن حضرات کے ذریعہ ہوئی ان میں صوفیاء کرام کا ذکر نمایاں طور پر کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندی مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد نے انہی صوفیاء کے ہاتھوں قبول اسلام کیا، اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں انہی بزرگوں نے دین کی روشنی پھیلائی۔ چونکہ اشاعت دین کا ان کا اپنا انداز تھا اور لوگوں کی اصلاح و تربیت کا مخصوص طریقہ کار تھا، اس لیے انھوں نے جس تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا۔ اس میں اس طریقہ خاص کا پورا اثر موجود ہے۔ چنانچہ ہندی مسلمانوں کے بہت سے افکار، خیالات، رسمیں اور رجحانات اسی طریقہ خاص کی مرہون منت ہیں۔ صوفیاء کرام کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ان کی خدمات کو قرآن و سنت اور مزاج شریعت کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے، نیز مسلم سماج پر مرتب ہونے والے ان اثرات کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا لازم ہے جو ارباب تصوف کے ذریعہ رونما ہوئے ہیں۔

تصوف کی ابتداء

تصوف اپنی ابتداء اور اصل کے لحاظ سے اسلام کے ان روحانی احکام سے ماخوذ ہے جن کو تزکیہ، اخبات، احسان اور تطہیر وغیرہ کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے اعمال اور اوراد و وظائف بھی زیادہ تر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں اور بظاہر اس کا مقصد بھی اسی مشن کو تقویت پہونچانا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی جانب سے سونپا گیا تھا۔ ابتدا اسلام میں تصوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ اس طرح کا کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظام پایا جاتا تھا، تزکیہ یا تربیتِ نفس قرآن وحدیث کی مجموعی تعلیم و تربیت کا ایک پہلو تھا جو دوسرے پہلوؤں سے مربوط اور منسلک تھا، بعد میں اس نے ایک نظامِ فکر و عمل کی صورت اختیار کرلی اور اس نے بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر البرنصری نادر کے بقول

"تصوف اپنی ابتداء میں دینی زندگی کی صورتوں میں سے ایک صورت تھی اسے افراد ہی اختیار کرتے تھے اور ان سے ان کے خاص اصحاب حاصل کرتے تھے پھر بتدریج یہ منظم تحریک اور مدرسہ بن گیا جس سے اولیاء بن کر نکلنے لگے اور اس کے قواعد اور رسوم بن گئے"[1]

تصوف کی تاریخ کے دو نمایاں دور قرار دئے جاتے ہیں۔ پہلا ابتدائی عہد سے نویں صدی تک کا اور دوسرا نویں صدی کے بعد کا۔ پہلے دور میں تصوف محض میلانات و رجحانات پر مبنی تھا، اس کا کوئی نظام نہ تھا دوسرے دور میں اس نے الٰہیات کا اپنا نظام مرتب کرلیا اور اپنے خانقاہی طریقوں کی تنظیم کی۔ تصوف کو ایک طریقۂ حیات کی حیثیت دینے اور متعارف کرانے کے لیے صوفیاء نے کشادہ ذہنی کے ساتھ اسلام اور دوسرے مذاہب سے استفادہ کیا اور جہاں سے جو چیز مناسب و معاون نظر آئی اسے اپنا لیا، یہ انتخاب و اختیار بہر حال مناسبت و مشابہت اور تقویت ہی کی بنیاد پر کیا گیا۔ ایرانی دانشور ڈاکٹر قاسم غنی کہتے ہیں کہ:۔

"واقع امر این است کہ تصوف طریقہ مرکب وبلسیار پیچ در پیچ است و منابع مختلف و متنوع داشتہ واز سرچشمہائے متعدد آبخوردہ است"[2]

حقیقت یہ ہے کہ تصوف بہت ہی پیچ در پیچ اور مرکب طریقہ ہے جس کے منابع مختلف اور متنوع ہیں، اور اس نے بہت سے سرچشموں سے سیرابی حاصل کی ہے۔

تصوف کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات خاص کا روحانی پیکر کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اسے سنتِ رسولؐ کے باطنی پہلو کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے مگر موجودہ نظامِ تصوف میں سنت رسولؐ کی مکمل پابندی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ بعض حالات میں دریائے تصوف کی موجیں شریعت

۱؎ ڈاکٹر البرنصری نادر، التصوف الاسلامی ص ۱۲، بیروت۔

۲؎ ڈاکٹر قاسم غنی، بحث در افکار واحوال حافظ ۲/۶۴، تہران ۱۳۲۵ھ۔

© rasailojaraid.com